OPEN ACCESS
Al Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219
ISSN (PRINT): 2707-1200

ARJISH, Vol: 5, Issue: 3,
July to September 2021
DOI: 10.53575/arjish.v5.3(21)u2.14-24
http://www.arjish.com

یوسف حسن کی غزل میں طبقاتی اور سماجی شعور

Social and class awareness in Yousuf Hassan's Ghazal

Jindwada Ayaz[*]
Dr. Ramzan Tahir[**]

Abstract
One of the striking and significant name of Ghazal poetry during the decade of seventies was Yousaf Hassan. He chose capitalistic mindset and social discrimination in Pakistani society as a permanent subject of his Ghazal. His poetry offers a critique of the materialization of social relations. He aims to posit mutual compassionate empathy and high humanistic values as the characteristic features of an individual. His poetic work Aye Dil Aye Darya comprises of remarkable verses which represent the perception about social as well as class discrimination. The striking feature of this representation is the portrayal of classical as well as traditional metaphors in a progressive context.
Keywords: Communism, Materialism, Social discrimination, Ghazal, Proletariate, Bourgeoise.

تاریخ کا ارتقائی منظر نامہ انسان کے سماجی شعور کی دستاویز ہے۔ انسان اور سماج کے درمیان باہمی توازن قایم رکھنے کے لیے ذی شعور لوگوں نے اپنی کوششوں سے معاشرے کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اجتماعی زندگی کا آغاز قبائلی نظام سے ہوا جس کی بنیاد قدرتی آفات اور نا موافق موسمی حالات میں اپنی بقا کو قائم رکھنا تھا۔ ابتدائی انسانی سماجوں میں اشتراکیت اور اجتمائیت بنیادی عنصر تھا۔ یہ سماج کی باہمی ترقی اور بقا کا ضامن تھا۔ بعد ازاں پیداوار اور زرائع پیداوار پر قبضے کی خواہش نے انسانی استحصال کا آغاز کیا اور معاشی بنیادوں پر قدروں کا تعین ہونے لگا۔ اس طرح جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں ملکیت اور قبضے کو مستقل رکھنے کی خواہش نے طبقاتی خلیج بڑھادی۔ خواہش جدلیاتی مادیت میں طبقاتی کشمکش کے طور پر جانی جاتی ہے۔ مادی فلسفے میں تمام انسانی تاریخ دراصل طبقاتی کشمکش کی عکاس ہے اور تمام تر معاشرتی ترقی اور زوال اسی کشمکش کی آئینہ دار ہے۔ ہر عہد میں سماجی شعور کے حامل دانشور طبقے نے معاشرتی ضروریات اور تقاضوں کو انسان کی حقیقی شناخت سے ہم آہنگ کر کے معاشرے کو اس کی صحیح سمت میں رواں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مارکسیت نے ایسے طبقے کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں طبقات، پیداوار اور ذرائع پیداوار میں توازن پیدا کر کے انسانی سماج کی حقیقی ترقی کا منشور وضع کیا گیا۔ یوسف حسن کا تعلق بیسویں صدی کے دانشوروں اور ادیبوں کی اس نسل سے تھا جنھوں نے سماج کے غیر متوازن رویوں کو جانچا، پرکھا، سمجھا اور مختلف طبقات کو اس کا شعور دیا۔ پروفیسر یوسف حسن صحیح معنوں میں دانش ور تھے۔ وسیع مطالعہ اور نظریے کی پختگی انکی دانش وری کے مضبوط ستون تھے۔ نظریاتی اعتبار سے وہ مارکسسٹ تھے، تاہم وہ مارکسی سوچ والے کئی دوسرے لوگوں کی طرح مارکسزم کو عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ سماجی سائنس کے طور

[*] Ph.D scholor, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur.
Email: Jindwadaayyaz.gpc@gmail.com, https://orcid.org/0000-0001-7612-1923
[**] Assistant Professor, Department of Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur.
Email: ramzan.tahir@iub.edu.pk, https://orcid.org/0000-0001-5194-2530

پر برتتے تھے۔ خود یوسف حسن اپنی فکر اور نظریے کی مروج تعریفات سے ہٹ کر بھی اس کے اپنے لیے معانی اور حدود متعین کرتے رہتے تھے۔ ترقی پسندی کی تعریف کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہیں:

"عمومی ترقی پسندی، جدید دور میں اپنی اعلیٰ ترین سطح پر سماجی رشتوں کے ایک ایسے نظام کی تشکیل کے لیے فکر و عمل ہے جس میں ہر فرد کی طبیعی اور ذہنی یا روحانی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں آزادانہ اور ہم آہنگ نشو و نما پا سکیں اور صحیح معنوں میں ایک پورا انسانی فرد بن سکے اور اپنی انفرادیت کو نکھار سکے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے ایک طرف ذرائع پیداوار کا انتہائی ترقی یافتہ ہونا بھی ضروری ہے اور اس کے ساتھ طبقاتی تضادات کا خاتمہ بھی لازم ہے۔ [1]

یوسف حسن انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن تھے۔ 2009ء میں انھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد میں ایک بہت تفصیلی خطبہ دیا جس کا پہلا نکتہ ہی یہ ہے کہ انجمن ترقی پسند تحریک ایک مشترکہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ اس میں عقائد کے حامل لوگ بھی شامل ہیں اور کسی عقیدے کو نہ ماننے والے بھی ہیں۔ کوئی ایک بھی دوسرے کے نظریے کو چھیڑے بغیر اپنے مشترک مقصد پر نگاہ رکھے تو ہی تنظیم کی فلاح و بہبود اور پیغام کی ترویج کا راستہ کھلا رہے گا کیونکہ اس تنظیم کا کسی حکومتی ادارے یا منافع بخش تنظیم سے تعلق نہیں ہے۔

یوسف حسن انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کا سب سے اہم نکتہ "سامراج دشمنی" کو قرار دیتے ہیں۔ دوسرا نکتہ ان کے نزدیک "ادب کی تعریف کا متعین کیا جانا" ہے۔ تیسری دنیا میں پسے ہوئے طبقات کے لیے ادب کس طرح نجات اور فکر کی درستی کا ذریعہ بھی بنے اور اپنے عظیم مقاصد اور جمالیات سے بھی تہی ہو کر محض نعرہ بن کر نہ رہ جائے۔ اسی حوالے سے وہ پاکستان کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی سب سے پہلی ترجیح پاکستان کو ہی قرار دیتے ہیں لیکن اس عمل میں بھی سیاست سے بڑھ کر فوقیت ادب کو ہی حاصل رہنے کی طرف بھی توجہ مبذول کرواتے یوسف حسن کے ہاں جہاں جدوجہد کے راستے میں ملنے والی مشکلات کا سراغ ملتا ہے وہیں وہ پیچھے ہٹنے یا صبر کی چادر اوڑھنے کے بجائے مسلسل عمل کا پیغام دینے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور عمل پہ ابھارنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس قافلے میں قافلہ سالار بن کے اس قافلے کو روانہ کرنا چاہتے ہیں:

ہم نے گھٹ گھٹ کے سلگنا نہیں سیکھا یوسف
درد وہ درد ہی کیا اپنا جو مشعل نہ ہوا [2]

پاکستانی ادیبوں میں ترقی پسندی کے عناصر اور مارکسی واشتراکی فکر نے جن بڑے اذہان کو جنم دیا اور جنھوں نے نسلوں کو متاثر کیا ان میں یقیناً یوسف حسن ایک قابلِ قدر کردار کے حامل رہیں گے۔ انھوں نے نہ صرف ترقی پسندی کے عناصر پر مشتمل ادب تخلیق کیا بلکہ تنقیدی حوالے سے بھی بہت سا کام کیا اس کے ساتھ ساتھ وہ اس فکر کے نظریاتی پہلوؤں کے شارح بھی رہے۔ انھیں اگرچہ خود تک آتے آتے اس دریا کی طغیانی کے ماند پڑنے کا دکھ رہا اور ان کی شاعری میں یہ چیز بارہا اظہار پاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی فکر سے منہ نہیں موڑتے۔

زندگی کے بارے میں یہی آگے بڑھ کے اپنا حق لینے کا رویہ ان کے ہاں ایک مستقل فکر بن جاتا ہے۔

؎ دستِ دعا اُٹھائے تو اک عمر ہو چلی
کوئی قدم اُٹھاؤ کہ زنجیرِ پا گرے [3]

؎ جس خاک میں ہنگامہ ہستی نہیں یوسف
اُس خاک میں ہنگامہ محشر نہیں ملتا [4]

زندگی کے رنگوں اور بھرپور رویوں کی عکاسی کو انھوں نے افعال کی کثرت کے ساتھ بھی پورا کیا۔ ان کے کلام میں افعال ایک خاص انداز میں جگہ پاتے ہیں۔ خصوصاً ردیف اور قافیے میں افعال کی پیش کش کے ذریعے وہ کلام کو متحرک اور بااثر بناتے رہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی وہ حرکت سے بھرپور الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں اور علت کا سبب بننے والے اشعار سے گریزان کا شیوا رہا۔ اس کا ثبوت ان کی مختلف رسائل میں شامل ہونے والی شاعری اور بعد ازاں اس کی بدلی ہوئی شکل سے ملتا ہے۔ ترقی پسندی کے ان رویوں کے بارے میں شفیق انجم کا خیال ہے:

"یوسف حسن عمر بھر ایک سچے ترقی پسند داعی کی حیثیت سے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے والوں میں سے ہیں۔ جس صبحِ نو بہار کا غلغلہ ماضی قریب میں بلند ہوا اور جس نے قرنوں سسکتی انسانیت کے لیے امید کا ایک روشن زاویہ مرتب کیا، یوسف حسن کو اس کے تنکا تنکا ہو جانے کا غم تو ہے لیکن وہ مایوس بالکل نہیں۔ ان کی غزلوں میں اکثر و بیشتر شکستِ تمنا پر اظہارِ افسوس کے ساتھ ساتھ للکار کا ایک دبدبہ سا ضرور ابھرتا ہے۔ [5]

حکمرانوں اور معاشرے کے بالادست طبقے نے جس طرح انسانوں کو خانوں میں بانٹ دیا اس کے خلاف یوسف حسن کی جدوجہد آخری دم تک جاری رہی۔ یوسف حسن کی شاعری میں طبقاتی تقسیم کے خلاف یہ شعور بھرپور ادبی التباس میں سامنے آتا ہے۔ ایک ترقی پسند شاعر کی کی حیثیت سے ان کا خواب انسانی تاریخ کے اس منطقے سے متعلق ہے جب سماجی عمل طبقاتی تقسیم سے آزاد رہ کر اپنے فطری تسلسل میں رواں دواں تھا۔ اس کے بعد کا دورانیہ جبر و استبداد کا ایک تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ طبقاتی تقسیم کے حوالے سے جو جدلیاتی انداز ہمیں یوسف حسن کے ہاں ملتا ہے وہ اپنا اظہار کئی طرح سے کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ علت و معلول کی کارفرمائی کو اپنے اشعار میں لا کر نہ صرف کوئی وقوعہ بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے اسباب و علل اور وجوہات کو بھی ضرور سامنے لاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اس حوالے سے واضح انداز میں دو گروہ یا طبقات ملتے ہیں۔ پرولتاری اور بورژوائی جیسی الفاظ کے بجائے وہ غزل کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے بلیغ استعارے ہی برتنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ہاں پائے جانے والے دو مختلف طبقات کے لیے جو اہم استعارے سامنے آتے ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

دھرتی / زمین / خاک اور فلک / آسمان
صحرا اور دریا
خرابہ اور گھر

اجالا اور اندھیرا (دھندلکا)

دھوپ / شعلہ اور سایہ / پرچھائیں

عرش اور پنجرا

دن اور رات

بہار اور خزاں

دشت (وحشت، آزادی اور شوق کی جگہ) اور در (سماجی قیود اور پابندیوں کی جگہ دھرتی اور فلک کے تعلق سے اگر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو واضح انداز میں فلک کا استعارہ بالادست اور بورژوا طبقے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اس میں غزل کے اندر رائج معانی قسمت، دشمن اور خدا سے جداگانہ مفہوم موجود ہے۔ یوسف حسن زمین و آسمان اور حکمران و عوام دونوں کے لیے مساوی حقوق اور جینے کے یکساں مواقع کے پرزور حامی تھے۔ وہ زمین کی رنگینیوں اور زرخیزیوں کے قائل بھی تھے اور اس زمین کی علامت بن کے پائمال ہونے والے طبقے کو بھی حقوق دینے کے لیے پرعزم تھے۔

ے ہنگامۂ خاک ہی سے پوچھو
اندیشۂ آسمان کیا ہے [6]

یوسف حسن کے ہاں آسمان کو مخاطب کرنا کا یہ انداز اگرچہ اردو غزل کی روایت کے معروف کردار آسمان سے مکالمہ ہے جو خدا اور قسمت کے معنی میں یہاں بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ مخاطبت حاکم طبقے کے بچھائے ہوئے جال کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ طبقہ جو عوام کو ہمیشہ رہائی کے سراب میں رکھتا ہے لیکن تمام آزادیوں اور سہولیات کو اپنے دامن میں ہی سمیٹے رکھنا چاہتا ہے۔ عوام کے ہاں جو امکانات پائے جاتے ہیں ان کو محدود کرنا اور عوام کو بڑھنے اور ترقی کرنے سے روکنے میں ہی اس بالاتر طبقے کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ اسی لیے یہ طبقہ عوام کے بال و پر کو کاٹنے کے درپے رہتا ہے۔ بال و پر کو اسباب سے وابستہ کرنا شاعر کے ہاں اس شاعرانہ انداز کا غماز ہے جو بات کو ایمائیت کے پردے میں بھی کرتا ہے اور استعاراتی جہت بھی قائم کرتا ہے۔

آسمان یعنی حاکم طبقے کی اصلیت کے بارے میں شاعر سنجیدہ سوالات قائم کرتا ہے جن کا جواب سماج میں پائے جانے والی طبقاتی تفاوت کو قاری پر آشکار کرتا ہے۔ زمین کے جلنے، سلگنے اور ہر پل آسمان کے لیے قربان ہونے میں ہی اس طبقے کی ساکھ پنہاں ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں ریاستی ادارے اور سیاسی نظام عوام کو جس جبر کا شکار کرتا ہے شاعر اس پر رنجیدہ ہے۔ عوام کے جلنے سے جو روشنی ہو رہی ہے اسے بھی یہ طبقہ اپنی ہی کاوش بتا کے کسی اور کی محنت کو اپنے کھاتے میں شمار کروا کے مزید سہولیات کا تقاضا کرتا چلا جاتا ہے۔ یوں آسمان اور زمین ہی نہیں بلکہ تابانی اور شام بھی ترقی پسند بیانیے کے وہ استعارے بن جاتے ہیں جو مزاحمت کی داستان میں استحصال کی کہانی کو واضح کرتے ہیں۔

ے وہ خاک جو گردیدۂ افلاک نہیں ہے

ہر آن میں امکانِ دگر میں اُسے دیکھوں [7]

یوسف حسن کے ہاں مستقل یہ فکر موجود رہتی ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ عوام اپنے حقوق کو پہچان کے خود پہ مسلط طبقے سے نجات حاصل کر لیں گے۔ افلاک کی گرویدگی نے ہی خاک میں ملتے ہوئے لوگوں کو یوں پاتال میں دھکیلا ہوا ہے۔ اس امکان کا حل خاک اور افلاک کے طبقات کی تفاوت کے ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ہی ممکن ہے جس نے دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل بھی کھڑا کیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی قسمت کے فیصلے کہیں اور ہی کیے جاتے ہیں اور عالمی طاقتیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے جس طرح ان ممالک کی اشرافیہ کو اپنا غلام بنانے کے لیے مراعات سے نوازتی ہے وہ بالآخر ان کو عوام دشمن فیصلے کرنے کے لیے عالمی طاقتوں اور اداروں کے سامنے اپنے عوام اور ان کے وسائل گروی رکھنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ افلاک پر خاک نشینوں کے فیصلے ہونے کی بات میں یوسف حسن اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

؎ علوئے عرش کا رستہ بھی کھولو
مگر پہلے مرا پنجرا بھی کھولو [8]

؎ ہم بھی پربت کاٹتے ہیں اور مٹی چاٹتے ہیں
ہم بھی تیرے کنبے میں ہیں شامل اے دریا [9]

؎ وسوسے ہی وسوسے روح میں بھرے ہوئے
کیا جییں گے شہر میں شہر سے ڈرے ہوئے [10]

روح میں بھرے ہوئے ان وسوسوں کی نوعیت ذہنی اور فکری ہے لیکن شہر کے باسی سماج کے وہ جیتے جاگتے کردار ہیں جن کی جسمانی اور وجودی حیثیت ہر لمحہ زندگی سے کچھ مادی لوازمات کی متقاضی ہوتی ہے۔ سماج کا یہ خوف جس سوال کو جنم دے رہا وہ اپنی نوعیت میں جہاں تھکن کو جنم دیتا ہے وہیں فرد میں اس سے آزادی کی لگن کو بھی جنم دیتا ہے اسی لیے شاعر کے ہاں مایوسی کے عناصر سے نبرد آزما ہونے کا تیقن پیدا ہوتا ہے۔

؎ اک سوال ذات کا شعلہ شش جہات کا
کیسے اپنے واسطے ہم بھی دوسرے ہوئے [11]

"ثقافتی مظاہر کو بھی مفاد پرست استحصالی عناصر نے نہایت بے دردی سے اپنے ذاتی مفادات کے تابع بنا کر ہمیں اقوامِ عالم کی صف میں تماشا بنا دیا ہے۔ طالع آزما اور ابن الوقت مفاد پرستوں کی بے بصری اور کور مغزی کا لرزہ خیز نتیجہ یہ نکلا کہ علم و ادب کو بھی بازار میں عام فروخت ہونے والی اجناس کا درجہ دیا جانے لگ۔ "۔ [12]

زندگی میں جدوجہد کرنے والے لوگ ایک خاص طرح کی رجائیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ امید پسندی ان کے منشور میں

بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ سفر کے رائیگاں جانے کی بات کرنا یالاحاصلی اور سراب کی طرف اشارہ کرنا حوصلوں اور مورال میں کمی کا سبب بنتا ہے۔اپنی فکر میں یوسف حسن ویسے بھی آگے بڑھنے اور فاعلی رجحان کے حامل تھے۔

؎ دریا سے کوئی صدا اٹھی تھی
پھر آر نہ پار ہم نے دیکھا [13]

؎ طغیانیِ دریا کی عنایات ہیں ہم پر
ویرانیِ ساحل ہے تماشائی ہماری [14]

یوسف حسن ساری زندگی مارکسی فکریات کے ساتھ یوں وابستہ رہے جیسے اپنی فوج سے اس کا ایک جانثار سپاہی وابستہ ہوتا ہے۔ایسا سپاہی جو اپنے مورچے پر ڈٹا رہتا ہے اور اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ جس فوج کے لیے وہلڑ رہا ہے وہ توکب کی پسپا ہو چکی۔ بس وہی اکیلارہ گیا ہوتا ہے، منحرف یا پسپا ہونے والوں سے بے نیازاپنے موچے پر ڈٹا ہوا۔[15]

یوسف حسن کے ہاں ادب کے نظری اور تھیوری سے وابستہ مباحث شعوری طور پر یوں برتے گئے ہیں کہ انھوں نے اپنی استعارہ سازی کی۔ استعارہ بنانے کے عمل میں انھوں نے دریا کے تلازمے سے جن مظاہر کو چنا انھیں سماج اور طبقات کی نمائندگی کا ذریعہ بھی بنایا۔ان کی جدلیاتی سوچ کے تقابلی مطالعے میں کچھ اہم چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ان میں سب سے اہم دریا اور صحرا ہیں۔دونوں کی اصل یارابطہ کہیں جڑوں میں پیوست ہے۔دریا کی تہہ میں بھی صحرا موجود ہوتا ہے اور صحرا کے نیچے بھی کہیں دریا کے ہونے یا اس راستے سے گزرنے کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

؎ ریگِ ساحل کا بہاؤ اور تھا
ریگِ صحرا کی روانی اور ہے [16]

یہاں ریگ اور ریت کا دریا کے ساتھ آنا اور ان کی روانی کا تبدیل ہونا دراصل معاشرے کے ان دو طبقات کی طرف اشارہ ہے جنھیں ترقی پسند پرولتاری اور بورژوا طبقات کے نام سے موسوم کرتے رہے۔ ریگِ ساحل کا بہاؤ نعمتوں اور زندگی کی سہولیات سے فیض یاب ہونے والے طبقے کی طرف اشارہ ہے جبکہ صحرا کی ریگ حالات کی چکی میں پستے ہوئے طبقات کی کہانی بیان کر رہی ہے۔دونوں ہی طرف اس کی عنایات رواں دواں ہے حالی، اقبال اور یوسف حسن کے ہاں جدوجہد اور گروہی یا سماجی علائق کے لیے آنے والے استعارے کی جہات مشرق یا جنوبی ایشیا اور مسلم خطوں کے دکھوں سے بھی دور نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی حدیں انسانی آزادی اور خود مختاری کی سرحدوں تک محیط بھی ہے۔ حالی اور اقبال نے اسے اسلامی جمالیات اور بیانیے کا حصہ بنایا جبکہ یوسف حسن نے اسے شعوری طور پر سیکولرائز کیا ہے۔ وہ خود اس چیز کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہیں:

"ادب کے ترقی پسند نظریے کی وایت ادب کے ادب ہونے کی پہلی لازمی اور امتیازی شرط یہ ہے کہ وہ فنی اور جمالیاتی

خصوصیت کا حامل ہو۔ دوسرے یہ کہ ادب کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہے۔ تاہم ترقی پسندی میں استحصالی سماجی رشتوں کے خاتمے اور انسانیت نواز سماجی رشتوں کی تشکیل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تیسرے یہ کہ ترقی پسندی میں سماجی زندگی میں بھی اور ادب میں بھی انفعالیت پسندی کے مقابلے میں فعالیت پسندی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ "[17]

سماجی رشتوں کے تعلق کی وہ کیفیت جس میں رشتے ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ انسانی سطح پر قائم ہوں اسے ہی یوسف حسن کے ہاں پزیرائی مل رہی ہے۔ استحصالی سماجی رشتے اور انسانیت نواز رشتے یہ وہ دو قطبین ہیں جو سماج کی طبقاتی تقسیم میں ایک نئی جہت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ ہر رشتے میں ہی موجود دونوں رویے اس سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ کسی خاص شعبہ زندگی کو اس میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگرچہ بعض زندگی کے شعبے اپنی نہاد میں انسانیت دشمن اور استحصال کے نمائندے بن جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر کسی ایک شعبے کو اس زمرے میں شامل کرنے سے انھوں نے شعوری طور پر احتراز برتا ہے۔

ہم پیاس ہیں ایک دوسرے کی
صحرا میں وصال ہے ہمارا [18]

سماجی رشتوں کی یہ نوعیت ایسی ہے جس کو شاعر مفادات سے بالاتر ہو کر سامنے لاتے ہیں۔ دریا کا خاتمہ ہونا اور دریا کا صحرا میں بدلنا ایک طرف تو کچھ رشتوں اور تعلقات کا خاتمہ کرتا ہے لیکن شاعر یہاں ایک ایسے تعلق کا خواب دیکھ رہا ہے جو ہر مفاد سے بالاتر ہو کے صرف ایک دوسرے کی چاہت کے رشتے کو بحال رکھتا ہے۔

یوسف حسن کی یہ سماجی سوچ پاکستان کے مختلف علاقوں سے قلبی وابستگی کا مظہر ہے۔ وہ استحصالی رشتوں کا خاتمہ بھی چاہتے ہیں اور سب کا اس دریا کی روانی اور عنایات پر حق بھی تسلیم کیے جانے کا اعلان کرتے ہیں۔ انسانی سطح پر سماج کا مطالعہ سب سے بڑا مسئلہ بازار اور معاش سے وابستہ تعلقات کو ٹھہراتا ہے۔ بازاری لہجے، بازاری رویے اور بازاری رشتے سب ہی شاعر کے آدرش سے مطابقت نہیں رکھتے۔ سماجی کی یہ عکاسی یوسف حسن کے ہاں بھی بہت بار اپنا ظہور کرتی ہے۔ سب سے پہلے جو چیز انسان پر اثر انداز ہوتی ہے وہ اس کا وجود ہے۔ جب انسان اپنے جسم اور وجود کو بھی من چاہے طور پر نہ چلا سکے تو ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی بک چکا ہے۔

یوسفؔ ایسے کھوئے ہم بازار کے اسرار میں
آخر اپنی ذات بھی تحویلِ زر میں آ گئی [19]

بازار کی بندگی ہے یوسفؔ
دربار کی آن بان کیا ہے [20]

بازار میں کھونا اور اس میں اپنی قیمت نہ ہونا بلکہ ہر رشتے کا بک جانا یوسف حسن کے ہاں نہ صرف ترقی پسند فکر کے نتیجے میں آیا بلکہ اپنے نام کی مناسبت سے ان کے ہاں یہ اردو غزل کی معروف تلمیح یوسف علیہ السلام کی مختلف جہات بھی آئی ہیں۔ یوسف علیہ السلام کی تلمیح اردو شاعری

کی روایت میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ عربی سے فارسی اور پھر اردو میں آنے والی اس تلمیح میں جہاں اول اول باپ اور بیٹے کی محبت میں پائے جانے والی جہات آتی ہیں۔

؎وہ بھی نہ مجھے بیعتِ بازار میں چاہے
میں نہ کبھی سایۂ زر میں اُسے دیکھوں [21]

یوسف حسن کی ساری زندگی حقیقت پسندی کی روایت کو ہی فروغ دیتے رہے اور عقلی بنیادوں پر ہی انسانی مزاج اور عقائد و روحانی معاملات کو بھی واضح کرتے رہے۔ چاہے وہ کوئی وجودی مسئلہ ہو یا مارکسی اور سوشلسٹ فکر کی بات ہو انھوں نے تعقل اور تدبر کے ذریعے اس کو حل کیا۔ یہی چیز ان کے سماجی اور طبقاتی شعور میں سادگی، ملنساری، پسے ہوئے طبقے سے محبت اور دوسری انسانی خصوصیات کی شکل میں اجاگر ہوئی۔

"حریت فکر کے اس مجاہد نے مظلوم طبقے کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ استحصال کا ہر انداز مسترد کر دیں اور حریتِ ضمیر سے جینے کی راہ اپناتے ہوئے فسطائی جبر کے سامنے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیں۔ نمود و نمائش، تعلّی اور خود ستائی سے یوسف حسن کو شدید نفرت تھی۔"[22]

شاید یہی وجہ تھی کہ اس روشن ضمیری نے ان میں مذکورہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ یہ چیز ان کے مذہبی نظریے سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ وہ مذہبی طور پر پاک و ہند کے عام سنی العقیدہ مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خدا کے بارے میں ان کی شاعری میں ایک خاص تصور پایا جاتا ہے۔

؎تُو کہاں سے پکارتا ہے مجھے
میں تجھے ڈھونڈتا ہوں خلقت میں [23]

خلقت میں خدا کو تلاشنے کی بات مذہب کی تعلیمات میں بھی موجود ہے لیکن یوسف حسن کے ہاں یہ نکتہ ان کی فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انسان دوستی کے جس فلسفے کو شعر میں پیش کر رہے ہیں اس کی بنیادیں سیکولر سماج میں بھی انسانی رواداری کو جنم دیتی ہے۔ خدا کا پکارا جانا انسانی روح کی آواز ہے۔ یہ آواز جب تعقل کی بنیاد پر اپنی فکر کو استوار کرنے والے اذہان پر دستک دیتی ہے تو وہ اس کی بھی عقلی توجیہات کرنے کی سعی میں مشغول و منہمک ہوتے ہیں۔ یہاں یوسف حسن خدا کے تصور سے وابستہ فلاح اور نجات کی طرف بلانے کی پکار کو خلق سے جوڑ کے خدا اور کائنات میں ایک رشتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کے ذریعے خدا تک رسائی میں انھیں اپنی ہی نہیں بلکہ مخلوق کی بھی فلاح نظر آتی ہے۔

ایک ترقی پسند ذہن جب مذہب کی نمائندگی کرنے والے طبقات کی اس روش کو دیکھتا ہے کہ وہ لوگوں پر گھٹیا مال دے کر بھی احسان جتلاتے ہیں اور لوگوں پر جینے کی راہ مزید تنگ کر دیتے ہیں۔ اس ذہنی کرب میں سوچ بچار کرنے والا ذہن بالآخر خدا کو مخاطب کر کے یہ کہنے میں شاید حق بجانب ہی ہو:

؎ یہ جسم و جان تری ہی عطا سہی لیکن
ترے جہان میں جینا مرا ہنر بھی تھا [24]

یوسف حسن کے سماجی اور طبقاتی شعور میں معاشرے کی وہ تمام سچائیاں شامل ہیں جنھیں لوگ اپنے عمل یا اپنے عقیدے میں اپناتے ہیں اور جس کی بنیاد پر ان کی رسوم و رواج اور تہذیب و تمدن میں معاشرتی تنوع و قوع پذیر ہوتا ہے۔ وہ فرد کی آزادی کے قائل بھی ہیں اور اس کی شخصیت میں استحکام کے لیے اس کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے والے اقدامات بھی چاہتے تھے۔ شاعری ہو یا نثر اور تنقید ہر ایک میں ان کے پیشِ نظر یہ چیز رہتی تھی کہ اپنے قارئین کی ذہن سازی کرتے ہوئے ان کے کسی طرح کے عقائد پر بھی تنقید سے گریز کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہن کو کھولنے والے تعقل کی بنیاد پر ہر چیز کا جائزہ بھی ان کے سامنے تھا۔ طبقاتی نظام کی بنیاد ان کے نزدیک معاشی نظام کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ چاہے یہ خدا کے تصور سے بھی وابستہ ہو پھر بھی معاشی مسئلہ ہی وہ بنیادی چیز ہے جو دو مختلف طبقات کی تقسیم کرتا ہے۔

"فرد کی شخصیت کو ادھورا طبقاتی، سماجی، معاشی نظام نے بنایا ہے لہٰذا اس طبقاتی سماجی، معاشی نظام کا خاتمہ لازم ہے۔ کسی دوسرے شعبے کے مقابلے میں ادب میں پوری شخصیت کے اظہار کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ خود ادب کی تخلیق میں فرد کی متعدد صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں۔" [25]

یوسف حسن کی شخصیت، شاعری، تنقید، نثر اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا بغور جائزہ لے کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلکہ اپنی زندگی اور فن کے ہر شعبے میں بھی ترقی پسند فکر کو اپنایا اور مذہبی، معاشی، اخلاقی، تعلیمی اور تنقیدی و ادبی ہر ایک شعبہ ہائے زندگی میں پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کو اپنا شعار بنایا۔ زندگی کے آغاز میں ہی اپنے قصبے کے مزدور رہنما مرزا ابراہیم کے خیالات اور افکار سے فیض یاب ہوئے۔ کالج کی تعلیم تک پہنچتے پہنچتے اقبال کوثر کی شاعری اور فکر سے متاثر ہوئے۔ لاہور آنے کے بعد احمد ندیم قاسمی اور خالد احمد سے بہت کچھ سیکھا۔ حلقہ اربابِ غالب کے قیام اور مسلسل اقدامات کو لاہور سے شروع کر کے چکوال، کہوٹہ اور راولپنڈی میں بھی جاری رکھا۔ اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم کے سلسلے میں بھی انھیں عوام سے دور نہ کیا بلکہ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں تعلیم دلوائی۔ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز سکول کی تدریس سے کیا لیکن پبلک سروس کمیشن کے ذریعے چکوال، کہوٹہ اور راولپنڈی میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ایم۔ اے اردو تک کی کلاسوں کی تدریس کرتے رہے اور انھیں حالی و اکبر کی شاعری کا پرچہ پڑھانے کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ ساری زندگی کتاب سے تعلق کو نہ ٹوٹنے دیا بلکہ اتنا پختہ رکھا کہ آخری دم تک اپنی کتابوں کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ لکھنے کا طریقہ بھی منفرد تھا کہ خود فل سائز پیپر لے کر اسے اے فور میں کٹواتے اور پیپر کو چاروں طرف سے بڑی نفاست کے ساتھ ایک ایک انچ موڑ کے حواشی اور حوض بناتے اور پھر پن میں سیاہ روشنائی بھر کے اس کے ساتھ خوش خط کر کے تحریر کرتے تھے۔ اوراق، فنون، اردو ادب، بیاض، عوامی مزاحمت، طلوعِ افکار، ایکسپریس، جنگ اور دیگر رسائل و اخبارات میں تواتر سے چھپتے رہے۔ سیکھنے کا عمل شروع کیا تو بہت سے لوگوں سے سیکھا۔ احمد ندیم قاسمی، اقبال کوثر، خالد احمد، شریف کنجاہی، اختر ضیائی، تنویر سپرا، صوفی محمد الدین آرا، شمیم سدوزئی احمد سے ریاضت اور مشق سیکھی اور فن کے بہت

سے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی۔ ساری زندگی رسائل و جرائد میں تو تواتر سے چھپے لیکن خود اپنی شاعری یا تنقید کی کتاب چھپوانے کی کوشش نہ کی بلکہ مسلسل اپنے کلام اور تنقیدی خیالات کو سنوارتے رہے۔ آخری دم تک سیکھنے کے عمل سے پیچھے نہ ہٹے۔ مکالمے کے لیے اپنے بزرگوں سے لے کر ننھے منے نواسے اور پوتے پوتیوں تک سے مکالمے کو جاری رکھا اور سوچنے کی طرف ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات پیش کرنے کا حوصلہ دیتے رہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی میں علی عباس جلالپوری، عابد حسن منٹو، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، اور دیگر بہت سے احباب کے ساتھ تنظیمی معاملات پر بات چیت اور عمل کی راہ استوار کی۔ اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی لکھا۔ مقامی اور علاقائی زبانوں میں تعلیم دینے کے شدید حامی تھے۔ اردو میں شاعری اور نثر و تنقید لکھنے کے باوجود اردو کو دوسری زبانوں پر ترجیح دینے کو استحصالی طبقے کا ایک ہتھیار جانتے تھے۔ اردو تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اردو کی شایع ہونے والی تاریخِ ادب کی کتب پر تنقید و تبصرہ چھپواتے۔ نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور جیسے استاد شاعروں پر بھی لکھا اور اپنے معاصرین کے علاوہ بعد میں آنے والے شاعروں احمد ظفر، حبیب فخری، منظور عارف، جمیل ملک، دانیال طریر، جلیل عالی، منیر منتظر اور قائم نقوی وغیرہ کے ساتھ معاصر افسانہ نگاروں پر بھی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ مغربی دانش وروں اور فلسفیوں مارکس، گیورگی لوکاس، بل وارن اور پال سویزے کے افکار و خیالات پر بھی لکھا۔ کتب کا جائزہ لیتے تھے اور رسائل میں تبصرہ کتب شایع کراتے۔

مسلسل عمل اور جدوجہد کا پیغام دیا۔ شاعری میں بھی ایسی استعارہ سازی کی کوشش کی جو حرکت و عمل اور فعالیت کی حامل تھی۔ انفعالیت کے بجائے ہمیشہ فعالیت کے حامی رہے۔ دریا، موج، لہر، کنارا، روانی، پانی، صحرا، ریت، دھرتی/زمین/خاک اور آسمان، خرابہ اور گھر، اجالا اور اندھیرا، دھوپ، شعلہ اور سایہ/پرچھائیں، عرش اور پنجرا، دن اور رات، بہار اور خزاں ان کے ہاں جدلیاتی انداز کے ساتھ استعاراتی سطح پر کثیر معنویت کے حامل ہو کر آئے۔ مارشل لا کے جبر کو بیان کرنے کے لیے کبھی نہ جھکے بلکہ اپنی شاعری میں اس پر موثر انداز میں روشنی ڈالی۔

؎ کس تکلف سے ہمیں زیرِ اماں رکھا گیا
آہنی پنجرے میں اپنا آشیاں رکھا گیا

؎ یوسف اب جو دم بہ دم برہم ہوئے جاتے ہیں ہم
کن فرشتوں کو ہمارا پاسباں رکھا گیا [26]

دھرتی محکوم طبقے کی علامت بن کر سامنے آئی اور فلک کو بالادست طبقے کی علامت بنایا۔ عوام کو اپنے حقوق جاننے اور حاصل کرنے کی راہ اپنانے کی تعلیم دیتے رہے۔ لوگوں کی مذہبی آزادی کے حامل تھے اور بعض مذہب دشمن ترقی پسندوں کے برخلاف ہر کسی کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے اور تصورات و عقائد رکھنے کے قائل تھے اور یہ بات کہتے تھے کہ ایک ترقی پسند صاحبِ ایمان بھی ہو سکتا ہے اور کسی ایمان یا عقیدے سے بری بھی ہو سکتا ہے۔ سماجی اور پیداواری رشتوں کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں معاشرے میں سماجی رشتوں کی دو ہی اقسام ہیں ایک تو استحصالی سماجی رشتے اور دوسرے انسان دوست سماجی رشتے۔ اپنے فن میں ریاضت کے قائل تھے

اور الفاظ کو صرف معنی کی وجہ سے ہی نہیں بدلتے تھے بلکہ ان کے صوتی اثرات کو بھی مدِ نظر رکھا کرتے تھے۔ دریاان کا خاص استعارہ ہے جو زندگی کی نعمتوں، سہولتوں اور ایک سطح پر خود زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ خدا کے بارے میں ان کا تصور خلق سے تعلق میں جڑا ہوا تھا جبکہ فرد کے حوالے سے وہ اس کی فکری اور عملی آزادی کے قائل تھے۔ یوسف حسن کی غزل اپنے عہد کے ایک صاحب فکر اور باشعور شاعر اور فنکار کا تخلیقی اظہار ہے جو سماج کی تمام تہ در تہ سچائیوں کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ اس کا کلام ایک فکری مجاہد کا رزمیہ ہے جو معاشرے کے محکوم طبقات کے حقوق کی فکری جنگ لڑتا دکھائی دیتا ہے۔

References

1- Yousif Hassan،Interview , Mushmola ,Andaz.e. Guftgo , Muratba : Yasir Sabri , Islamabad, Poraub Academi 2015 , p: 252
2- Yousif Hassan ,Ay Dil , Ay Durya,Rawalpindi:Romail house of publications, 201 , p :20
3- Yousif Hassan Ay Dil , Ay Durya, ,p :115
4- Yousif Hassan Ay Dil , Ay Durya ,p :58
5 - Shafeeq Anjum , Yousif Hassan ki Ghazal goi , mushmola , qurtas , July2008 , p 62
6 - Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p: 110
7 - Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p:138
8- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :23
9- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :51
10- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p: 21
11- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :21
12- Ghulam Shabbir ,Rana , Yousif Hassan : khud bhi loh.e. khak per tusweer /tehreer hona hy mujhy https://hamariweb.com/articles/112661
13- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :114
14- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :132
15- Muhammad Hameed Shahid , Mumtaz taruqi pasand adeeb o shaair ,prof Yousif Hassan, Qurtas Adab , july 2018, https://jang.com.pk/news/522648
16-Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p:116
17-Yousif Hassan , interview , mushmola ,andaz.e. guftgo , muratba : Yasir Sabri , Islamabad,Poraub Academi 2015 , p:252
18- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :47
19- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :140
20- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p :110
21- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p: 138
22- Ghulam Shabbir ,Rana , Yousif Hassan : khud bhi loh.e. khak per tusweer /tehreer hona hy mujhy https://hamariweb.com/articles/112661
23- Yuosif Hassan . Ghair mutboa Ghazliyat :mumloka Sheraz Hassan , Rawalpindi
24- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p : 121
25- Yousif Hassan , interview , mushmola ,andaz.e. guftgo , muratba : Yasir Sabri, Islamabad, Poraub Academi 2015 , p:253
26- Yousif Hassan , ay dil , ay durya ,p:135.136